© rasailojaraid.com

حکمتِ سیّد مودودیؒ

تنقید

تنقیدی نگاہ سے خرابیوں کو دیکھنے والی آنکھیں، بیان کرنے والی زبانیں اور سُننے والے کان اگر بند ہو جائیں تو جس قوم، سوسائٹی یا جماعت میں یہ حالت پیدا ہو گی وہ خرابیوں کی آماجگاہ بن کر رہے گی اور پھر اس کی اصلاح کسی طرح نہ ہو سکے گی۔ اس حقیقت سے ہم کبھی غافل نہیں ہوئے۔ ہم نے عام انسانیت کی، اپنے ملک کی اور اپنی ملت کی خرابیوں پر تنقید کرنے میں جو آزادی برتی، اُسی آزادیٔ تنقید کو اپنی جماعت میں بھی برقرار رکھا تاکہ جماعت کے اندر جہاں جو خرابی بھی موجود ہو، اس کی بروقت نشاندہی ہو جائے اور اُسے دُور کرنے کی کوشش کی جا سکے۔ جماعت کے ہر شخص کو محض تنقید کا حق ہی حاصل نہیں ہے بلکہ یہ اس کا فرض ہے کہ کسی خرابی کو محسوس کر کے خاموش نہ رہ جائے۔ یہ بات ہر رُکن جماعت کے اجتماعی فرائض میں داخل ہے کہ اپنے ساتھی ارکان کی ذات میں، یا ان کے جماعتی کردار میں، یا اپنی جماعت کے نظم میں، یا جماعت کے لیڈروں میں اگر کوئی نقص پائے تو اسے بلا تکلف بیان کرے اور اصلاح کی دعوت دے۔ اسی طرح جن لوگوں پر تنقید کی جائے ان کو بھی اس بات کا عادی بنایا گیا ہے کہ وہ نہ صرف تنقید کو برداشت کریں بلکہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور جس نقص کی نشاندہی کی گئی ہے وہ اگر واقعی موجود ہو تو اُسے دُور کرنے کی طرف توجہ کریں، ورنہ تنقید کرنے والے کی غلط فہمی رفع کر دیں۔

(اقتباس از جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل ص ۶۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دینی جدوجہد کا اصل محور

جناب سید محمد صمیم پاشا صاحب

(۲)

اخلاقی و معاشرتی نوعیت کی خرابیاں تو ایسی ہیں کہ معاشرے میں جاری و ساری ہونے کے باوجود ان کی ناپسندیدگی پر ایک رائے عام پائی جاتی ہے۔ جھوٹ، رشوت، چوری، فحاشی، بے رحمی وغیرہ کو یوں بھی دنیا کے عام اخلاق میں بُرا ہی سمجھا گیا ہے، کُجا کہ "مذہبی دلیلوں" سے ان کی حمایت میں لڑائی۔ یہ بُرائیاں تو ایسی ہیں کہ صرف ان کی نشان دہی بھی عیب کشا ہوتی ہے۔ اُن کے خلاف آواز اُٹھانے والوں کو معاشرے کی تائید بھی مل جاتی ہے، مگر شرکیہ تصورات و اشغال کی نوعیت ایسی نہیں ہے۔ یہ بُرائیاں خاص مذہبیت ہی کا جامہ زیبِ تن کر کے دین میں داخل ہوتی ہیں۔ انہیں کارِ ثواب اور قربِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر ہی کیا جاتا ہے، اُن کے خلاف بولنے والوں کے مقابلہ پر خود مذہبی ذوق رکھنے والے عناصر ہی کمربستہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی حقیقت کھولنے اور لوگوں کو ان سے بچانے کے لیے زیادہ محنت کی بھی ضرورت ہے اور زیادہ توجہ کی بھی۔

پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ تمام جرائم میں سرِفہرست اسلام نے کس کو رکھا ہے؟ کون سا حکم دے کر دوسرے احکامات دیئے ہیں؟ کس نقص کی اصلاح کے بعد دوسرے نقائص پر توجہ دی ہے؟ اور کس قصور کی بنا پر اعمالِ صالحہ کا دفتر بھی ردّی ٹھیرے گا؟ وہ گناہ آخر کیا ہے جس کو ظلمِ عظیم، کلمہ خبیثہ اور ضلال بعید جیسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقیر نام دیئے گئے اور جن کے مشرکین کو شر البریہ کا لقب دیا گیا؟ کیوں ایک شخص رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہو کر بھی بروز محشر آپؐ کی شفاعت سے محروم رہے گا؟ اور معصیت کی وہ کیا نوعیت ہے جس کے لیے بار بار خلود فی النّار کی وعید سُنائی گئی ہے؟ پھر ایک شخص شرابی یا چور یا رشوت خور یا فاحش ہونے کے ساتھ ساتھ بدعقیدگی کا بھی شکار ہو اور اس کا ایمان نظری اعتبار سے بھی نادرست ہو تو اس کی خیر خواہی کا تقاضا دینِ حق کیا بتاتا ہے؟ کس نقص کے باوجود اس کی آخرت میں نجات ممکن ہے اور کس کے ہوتے ہوئے اُس کے اعمالِ صالحہ بھی اُس کو فائدہ نہ دیں گے؟ ایک داعی کو اوّلین توجہ کس پہلو کی اصلاح پر دینی ہوگی؟ — حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک سنجیدہ مطالعہ بھی فکرمند کر دینے کے لیے کافی ہے، کیونکہ اسلام جس مسئلہ کو سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ توجہ طلب قرار دیتا ہے، اسی کی طرف سے ایک عام سُستی اور کاہلی ہے، بے حسی اور اغماض ہے، بے رخی اور عدم دلچسپی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (اللہ اس گناہ کو نہیں بخشنے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے۔ اور اس کے سوا دوسرے گناہ جس کو چاہے بخش دے گا اور جس نے اللہ کے ساتھ شریک بنایا وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔ نساء)

ایک دوسری غلط فہمی جو دراصل اوّل الذکر ہی کا ایک شاخسانہ ہے، یہ پھیلی ہوئی ہے کہ "چونکہ عقیدے کی غلطیوں کو سمجھانا تو ایک کارے دارد ہے، اکثر لوگ بات نکلتے ہی کترا کر نکل جاتے ہیں، ورنہ تاویلیں دینے لگتے ہیں، اُلجھ پڑتے ہیں، مان کر نہیں دیتے۔ البتہ اُلٹا اس خیر خواہی کو دشمنی پر محمول کرتے ہیں تو آخر یہ بھی کیا حکمت ہے کہ پہلے مرحلہ ہی پر اس موضوع کو اُٹھایا جائے؟ کیوں نہ ابتداءً ان اُمور کو لیا جائے جو متفقہ ہیں، جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہیں، جن کو ہر شخص سمجھتا ہے، جس سے اختلاف کی مجال کسی کو نہیں؟ اور پھر تبلیغ کی حکمت بھی تو عین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی ہے کہ پہلے قدرِ مشترک کو بیچ میں لا کر بات آگے بڑھائی جائے۔ اس "حکمت و مصلحت" کے ذیل میں قرآن مجید سے ایک آیت کا جزو بھی برائے تنبیہ سنایا جاتا ہے: قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۱آل عمران) "کہو، اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے"

حالانکہ درست نتیجہ اسی آیت کو پورا پڑھ دینے سے نکل آئے گا، جس میں محولہ جزو کے معاً بعد بہ صراحت موجود ہے: أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ۔ (آل عمران) (یہ کہ ہم اپنے اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے)۔ دیکھا تو جائے کہ اس آیت میں کون سی ایسی بات ہے جو اہل کتاب اور اہل ایمان کے مابین "متفق علیہ" تھی؟ آیا یہ کہ اہل ایمان کی طرح یہود و نصاریٰ بھی اِلٰہ واحد کی بندگی پر راضی تھے؟ یا یہ کہ وہ بھی اسلامی عقیدے کے مطابق عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو اللہ کا بندہ اور رسول ہی مانتے تھے؟ یا یہ کہ وہ نظریہ تثلیث کے مخالف تھے اور مسیحؑ کو اللہ یا ابن اللہ نہیں کہتے تھے؟ اپنے علماء کو شریعت سازی کا مجاز نہیں سمجھتے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں جس قدرِ مشترک کا ذکر ہے۔ وہ طریقین کے درمیان، صرف داعی ہی کے لیے تسلیم شدہ مگر مدعو کے لیے محض واجب التسلیم کے درجہ میں تھی۔ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ ہر دو گروہ دوسری ہزاروں برائیوں کے ساتھ ساتھ شرک کی بیماری میں مبتلا تھے جب کہ اُن کے انبیاء نے بھی اسی مرض سے اُن کو بچانے کے لیے سب سے زیادہ محنت کی تھی۔ ان کو بھی اسی دین کی تبلیغ کی گئی تھی جو آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پیش کیا جا رہا تھا، جس کا پہلا درس ہی اخلاص بندگی ہے اور دراصل یہی وہ بھولا ہوا سبق تھا جو ترتیبِ دعوت کے مطابق سب سے پہلے انہیں یاد دلایا گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر عام اس سے کہ اب کتنے مسائل اس امت میں اختلاف کی آماجگاہ بننے سے رہ گئے ہیں۔ اور امت کے باطل پر جمع نہ ہونے کی پیش گوئی برحق، مگر ایجاباً، ایسے اتفاقی امور کی تعداد کیا ہے جنہیں قوم کا ہر طبقہ مان رہا ہے، اور دین ایک، خدا ایک، نبی ایک، کتاب ایک کہنے کے بعد کتنے قدم ملا کر صحیح سمت کی طرف اٹھائے گئے ہیں؟ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آج جن مسائل کو "متفقہ" اور "ہر گروہ کے نزدیک تسلیم شدہ" کہہ کر ان کی جو اشاعت دین کی اس بنیادی تعلیم کے مقابلہ میں نمایاں کی جا رہی ہے، نوعیت کے اعتبار سے کس درجہ کی ہیں؟ وہ دین کا اصل ہیں یا اس کا فروع؟ مبادیات ہیں یا ان کے تقاضے؟ بنیادیں ہیں یا ان پر اٹھائی جانے والی دیواریں؟ اگر ان کی نوعیت پہلی نہیں، بلکہ دوسری ہے تو پھر وہ جڑ کہاں ہے جس پر یہ بارِ شجر آئے گا؟ وہ بنیاد کدھر ہے جو دیواروں کا بوجھ سہارے گی؟ یہ پھول، بوٹے اور شاخیں کس اصل سے پیوست ہوں گی؟ کیا اسلام کی بھی قلم لگائی جائے گی؟ یا سنت اللہ آج کے زمانے میں آکر بدل گئی ہے کہ پھل، پھول اور ڈالیاں پہلے اگیں گی اور جڑ بننے کا مرحلہ بعد میں آئے گا۔ آخر کب تک ایمانیات کے بنیادی مسائل کو "اخلاقی مسئلہ" کہہ کر ثانویت کا درجہ دیا جائے گا؟ اور کہاں تک "حکمت و مصلحت" کے نام سے کتمانِ حق اور رعایتِ باطل کے بوجھ لادے جائیں گے اور "تدریج" کی اصطلاح، دین کی ترتیب الٹ کر، اس کی جدوجہد کے لیے استعمال ہوگی۔

یہ بھی غور طلب ہے کہ اللہ کا دین کیا اس قدر مظلوم اور ایسا ہی مسکین ہے کہ اس کا ابلاغ لوگوں کی اجازت پر موقوف ہو؟ کیا شہادتِ حق کا ایسا ہی کچھ تقاضا ہے کہ دین کے انہی اجزا کو نشر کیا جائے جو عوام کو گوارا ہوں؟ کیا بندوں کی ناراضگی کی ایسی بھی کوئی قیمت ہے کہ اس کے مقابلے پر اللہ کی ناراضگی مول لے لی جائے؟ اگر دینِ حق کے احقاق کے لیے ایسی ہی لوچ دار تبلیغ کافی تھی تو یہ اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (احزاب)

(باقی برصفحہ ۴۷)

© rasailojaraid.com